دین میں جذباتی عنصر

از جناب سید محمد نواز صاحب ایم۔ اے

ارباب حکمت و فلسفہ سے اُلجھے بغیر شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان جسم، عقل، اور روح کا مجموعہ ہے۔ کم از کم اس سے تو کوئی بھی انکار نہیں کریگا کہ انسان اپنی زندگی میں جن فطری ضروریات سے دوچار ہوتا ہے وہ اکثر انہی تین چیزوں میں سے کسی ایک سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ تین قوتیں اپنی اپنی مناسب خوراک کا مطالبہ کرتی ہیں، اور جس طرح فرد اور جماعت کے درمیان صحیح توازن قائم کرنا اجتماعی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے، عین اسی طرح خود انسان کے اندر ان مختلف مطالبوں کا بہ یک وقت متوازن طریق سے پورا کرنا انفرادی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

دُنیا میں جس قدر نظامات حیاتِ انسانی کے لیے پیش کیے گئے، آپ دیکھیں گے کہ انہوں نے اپنی اپنی بساط کے مطابق اِسی مسئلہ کو حل کرنے کی دانستہ یا نادانستہ کوشش کی۔ لیکن اکثر ایسا ہوا کہ وہ اِن تین قوتوں کو موزوں طریقہ سے مرتب (Adjust) نہ کر سکے۔ چنانچہ بدھ مت نے دنیا کے سامنے ایک ایسا روحانی نظام رکھا جس میں نہ صرف عقل اور بدن کے مطالبات کو نظر انداز ہی کیا گیا بلکہ انہیں کچل دینے پر روحانیت کی بنیاد رکھی گئی۔ اسی طرح عیسائیت جب بگڑ گئی تو اُس نے بھی ایک ایسا فلسفۂ حیات پیش کیا جو عقل و بدن کے مقتضیات کی نفی پر مبنی تھا، جس نے رہبانیت اور للّٰہیت کو ایک ہی چیز سمجھا، جس نے اپنے پجاریوں پر شادی تک کرنا حرام قرار دیا اور جس نے عدمِ تشدد کا ایک ایسا نظریہ پیش کیا جس پر آج تک عملی طور پر دُنیا کی ایک قوم بھی کامیابی سے عمل

پیرا نہ ہو سکی - برعکس اسکے دورِ حاضر میں مثال کے طور پر کیمونزم ایک ایسا مادّی نظام پیش کر رہی ہے جو انسان کی اُن ضروریات کا قائل ہی نہیں جنہیں "روحانی" کہا جا سکے - جو انسان کو سر سے پاؤں تک معدہ ہی معدہ تصور کرتا ہے اور محض اقتصادیات ہی کو انسان کا بنیادی مسئلہ قرار دیتا ہے - یہ اسی افراط و تفریط کا نتیجہ ہے کہ آج مغرب میں لامذہبیت پھیلتی چلی جا رہی ہے، کیونکہ کوئی مذہبی نظام، کوئی قدیم و جدید مسلک، ان لوگوں کو انسان کے بوقلموں اور مختلف النوع مطالبات کا سامنا کرتا ہوا نظر نہیں آتا، کسی میں ایک قسم کی کمی ہے تو کسی میں دوسری قسم کی۔

دینِ کامل اور فطرتِ انسانی کے مختلف مطالبات

ظاہر ہے کہ ایک کامیاب مسلک وہی ہو سکتا ہے جو فطرت انسانی کے تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھے، آدمی کی فطرت جن مختلف عناصر سے مرکب ہے اُن سب کی اہمیت محسوس کرے، اُنکے مطالبات سے گریز کرنے یا انکے وجود سے انکار کرنے کے بجائے اُنکا سامنا کرے اور ہر ایک کو اُسکی اہمیت کے مطابق نشوونما پانیکا موقع دے -

اس حیثیت سے ایک اسلام ہی آپ کو ایسا نظامِ حیات نظر آئیگا جس نے تلخ سے تلخ حقیقت کا سامنا کرنے سے دریغ نہیں کیا - انسان کی جسمانیت ایک حقیقت ہے، اس سے گریز ممکن نہیں - اسلام نے بدھ مت کی طرح نہ اسکا انکار کیا اور نہ اسے کچلنا چاہا، بلکہ مناسب حدود کے اندر اسکو نشوونما کی آزادی دی - اسی طرح انسان کے اندر عقل کی بے پناہ تنقیدی قوت موجود ہے - اسلام نے قرونِ وسطیٰ کے پادریوں کی طرح اسکی زبان بندی نہیں کی، آدمی کے سامنے ہندو دھرم کی طرح مابعد الطبیعات اور "مافوق الادراکیات" کا ایک گورکھ دھندا پیش نہیں کیا - اسلام سب سے اول ایک علمی و عقلی نظامِ حیات ہے جو اپنے آپ کو انسان کی ہر لمحہ ارتقا کرتی ہوئی عقل کے سامنے پوری بیباکی کے ساتھ پیش کرتا ہے -

لیکن اسلام صرف یہی نہیں، بلکہ اس سے زائد بھی کچھ ہے - وہ محض انسان کے دماغ ہی

کو اپنا قائل نہیں بناتا بلکہ اُس میں اگر ایک طرف جسم کے مقتضیات اور عقل کے مطالبات فطری حد تک پورے کیے گئے ہیں تو دوسری طرف قلبی بے اطمینانیوں اور روحانی بے قراریوں کا نہ صرف اعتراف ہے بلکہ علاج بھی موجود ہے -

تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے　　عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب!

قرآن میں اطاعتِ توحید کے لیے انسان کو جس قدر اُبھارا گیا ہے، اُس میں آپ دیکھینگے کہ کبھی تو منطقی استدلال سے کام لیکر عقلِ انسانی سے اپیل کی گئی ہے اور کبھی عقل کو بالائے طاق رکھکر براہِ راست اُن جبلی و وجدانی جذبات کو بیدار کیا گیا ہے جو فطرت انسانی میں پیوست کر دیئے گئے ہیں، اور کبھی عقل، قلب، وجدان غرضیکہ سبھی عناصر کو بیک وقت مخاطب کیا گیا ہے۔ مجموعی حیثیت سے شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ قرآن کا مخاطب عقل سے زیادہ قلب ہے۔ کیونکہ "قلبی شہادت" اور "وجدانی تصدیق" (Intuitive perception of truth) ہی ایمان بالغیب کی متحمل ہو سکتی تھی جو قرآن سے ہدایت پانے کی اہلیت کے لیے شرطِ اولین اور اتقا کا سب سے پہلا معیار ہے۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ ......

قرآن میں محبتِ الٰہی کا تصور | طورِ خطاب سے ہٹ کر اب ذرا خود خطاب کی طرف دیکھیے، اللہ خالق ہے اور حاکم - بندہ مخلوق ہے اور محکوم - صرف یہی دلیل آدمی کو خدا کی اطاعت پر عقلاً مجبور کر سکتی ہے - لیکن قرآن کریم نہ صرف خالقیت کی بنا پر خدا کی اطاعت ہی کی تعلیم دیتا ہے، یعنی نہ صرف انسان سے عقلی بیعت ہی لینا چاہتا ہے، بلکہ خالق کے ساتھ مخلوق کو "محبت" پیدا کرنے کی تلقین کرتا ہے، یعنی عبد و معبود، حاکم و محکوم کے درمیان ایک جذباتی اور روحانی رشتہ بھی قائم کرنا چاہتا ہے جس کے بغیر محض عقلی بیعت کی بنا پر قائم شدہ اطاعت ایک جسدِ بے روح کی مانند ہے -

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللَّهِ　　اور لوگوں میں سے ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا اور

أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ ۔ (بقرہ - ۱۶۵)

معبود بنا لیتے ہیں اور اُن سے محبت کرتے ہیں جس طرح اللہ سے کرنی چاہیے۔ مگر جو مومن ہیں، وہ تو سب سے زیادہ اللہ ہی سے محبت کرتے ہیں۔

فطرتِ انسانی کے وہ مبہم حصے جو عقل اور جسم کے مطمئن ہوجانے پر بھی تشنۂ تسکین رہتے ہیں، اُنکو اللہ میاں نے اپنی ذات کی محبت کی طرف منعطف فرمادیا ہے، تاکہ یہ کسی اور رَو میں نہ بہہ جائیں، اُنکی قوت کسی اور رستہ میں صرف نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ ایک شخص رُوسو، نطشہ، یا مارکس سے عشق کیے بغیر بھی اُسکے فلسفۂ حیات کا پیرو ہو سکتا ہے۔ لیکن قرآن کے نزدیک محض اتباع مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود اصلی تو اللہ کی محبت اور رضاجوئی ہے۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۔

کہدو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کریگا اور تمہاری خطائیں ڈھانپ لیگا،

اور یہ محبت محض یک طرفہ نہیں۔ بلکہ اُس طرف سے بھی نہ تو صرف عذابِ آخرت سے ڈرایا ہی جارہا ہے اور نہ صرف نجات اور جنت کے وعدے ہی ہو رہے ہیں بلکہ يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ اور فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ کے پختہ مواثیق ہو رہے ہیں، اور رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ کی سند مل رہی ہے اور:

فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ (المائدہ - ۵۴)

پس اللہ ایسی قوم پیدا کریگا جس سے وہ محبت کریگا اور جو اس سے محبت کرے گی۔

کا پیمان کیا جارہا ہے۔

اب خیال کیجیے کہ اس سے بلند تر معراج انسان کے لیے ممکن ہے کہ وہ خدا کا محِب ہو اور خدا اس کا؟ قرآن نے انسان کا جو تصور پیش کیا ہے اس سے بڑھ کر کونسا فلسفہ ہے جو اس احسن تقویم کو اور زیادہ بلند کرسکے۔ اور وہ قلبی جذبات محبت جو انسان کی فطرت میں ودیعت

کیے گئے ہیں، انکی تسکین و قرار کا ذریعہ اس سے بلند تر اور پاکیزہ تر کیا ہو سکتا ہے کہ محبتِ خداوندی کو انکا منتہا اور مطمحِ نظر قرار دیا جائے[1]

قرآن کا اسلوب بیان | اب ایک لمحہ کے لیے معنوی حیثیت سے قطع نظر کر کے قرآنِ حکیم کے اسلوبِ بیان پر غور کیجیے - نزولِ قرآن نے ایک طرف معنویت کے لحاظ سے ایک انقلابِ عظیم برپا کیا اور دوسری طرف اسلوبِ بیان (style) کے نقطۂ نظر سے عربی ادبیات کی تاریخ میں بالکل ایک نئے طرزِ کلام کی بنا ڈالی، جسکی تنزل یافتہ شکل ہم مقاماتِ حریری اور اسی سلسلہ کی اور کتب میں دیکھتے ہیں[2] - اب وہ مجموعی تأثر جو قرآن کے مطالعہ سے پیدا ہوتا ہے اس کا تجزیہ کیجیے تو آپ دیکھینگے کہ ایک طرف تو قرآن کے حکیمانہ مطالب عقل و دماغ کو اپیل کر رہے ہیں

[1] جن قوموں کے مذاہب انسان کے جذباتی عناصر کی تسکین کا سامان فراہم نہیں کرتے، ہم دیکھتے ہیں کہ اُنکے جذبات خود بخود غلط راہیں تلاش کر لیتے ہیں - اُنکی محبتیں اگر ایک طرف انفرادی زندگی میں اکثر محض عورت ہی کے وجود پر مرتکز ہو کر رہ جاتی ہیں، حتیٰ کہ اُن کا لٹریچر ابتدا سے آخر تک تمام تر عورت ہی کی پرستش سے معمور ہوتا ہے اور ع

آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

کا مصداق ہوتا ہے تو دوسری طرف اجتماعی زندگی میں اُن کے تمام جذبات نسل پرستی یا وطن پرستی یا قوم پرستی میں ضائع ہو جاتے ہیں، اور اُنکی سب خواہشیں سمٹ کر جُوع الارض کی خونخوار شکل اختیار کر لیتی ہیں اور اُنکی تمام محبتیں ع

کھا گئی روحِ فرنگی کو ہوائے زر و سیم

کا عبرتناک منظر پیش کرتی ہیں -

[2] ادبی حیثیت سے مقامات وغیرہ کے تنزل کی وجہ یہ تھی کہ یہاں صرف اسلوب ہی (اور وہ بھی غلط طریقے سے) قرآن سے لے لیا گیا تھا، اور وہ حسین معنویت جو اصل میں اُس حسین اسلوب کی محرک و مقتضی تھی وہ آتشیں صداقت جس نے آیاتِ قرآنی کا شعلہ فشاں لباس پہنا، وہ خاص سپرٹ جسکے لیے وہ مخصوص جسم طبعاً لابدی تھا، یہ تو یہاں غائب تھی، محض جسم مانگ لیا گیا تھا اور لباس پہنا دیا گیا تھا - معنویت اور اسلوب کے درمیان جو طبعی تعلق اور لزومیت ہونی چاہیے اس کا سرے سے وجود ہی نہ تھا -

اور دوسری طرف اُسکے الفاظ کا ترنم، سجع ترصیع، وزن اور قافیہ کا وہ عجیب استعمال جو محض اپنے ہی قوانین کا متبع ہے اور جو تمام بیرونی پابندیوں سے بے نیاز ہے یہ سب کچھ نادانستہ طور پر ہمارے قلبی جذبات کو بھی مسحور کر رہا ہے - اور ان دونوں کا مجموعی نتیجہ ہے وہ "الہٰی نغمہ جسکی آواز ہی سے آدمی کے آنسو جاری ہو جاتے ہیں[ل]" اگرچہ ظاہر ہے کہ قرآن کی محض ادبی نقطۂ نظر سے تنقید نہیں کی جا سکتی (اور شاید یہی خوف ہے جس نے آج تک علمائے اسلام کو اسلوبِ قرآن کے بارہ میں نسبتاً خاموش رکھا ہے) تاہم قرآن کی بلند پایہ شعریت جو شاعری نہیں لیکن شاعری سے زیادہ مؤثر ہے، اور اُسکی پاکیزہ ادبیت، ایک نا قابلِ انکار حقیقت ہے - یہی چیز ہے جسے ہم عموماً قرآن کی "فصاحت" (Eloquence) کہتے ہیں - اور اسکا ثبوت یہ ہے کہ اگر آپ قرآن کی کوئی سورت مثلاً سورہ کوثر کو لے کر اُس میں کوثر، وانحر اور ابتر کی جگہ انکے مُرادفات لگا دیں یا مثلاً سورۂ النجم کی ابتدائی آیات والنجم اذا ھوی، ما ضلّ صاحبکم وما غوی، وما ینطق عن الھوی، ان ھو الّا وحیٌ یوحیٰ میں آخری الفاظ کی بجائے انکے ہم معنی الفاظ لگا دیں تو اگرچہ مفہوم وہی رہیگا لیکن آپ دیکھینگے کہ وہ جذباتی تاثر (Emotional response) جو پہلی صورت میں پیدا ہوا تھا، ختم ہو کر رہ جاتا ہے - قرآن ایک حسین حقیقت ہے جس نے طبعی اور لازمی طور پر ایک حسین لباس پہن رکھا ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے اثر کو مجروح کیے بغیر ایک دوسرے سے جدا نہیں کیے جا سکتے[ﷺ]

ل "That Divine symphony the very sound of which moves me to tears" Marmaduke Pickthall : Preface to *The Meaning of the Glorious Quraan.*

ﷺ یہی وجہ ہے کہ قرآن کا "ترجمہ" (Translation) نہیں کیا جا سکتا، صرف مطالب بیان کیے جا سکتے ہیں -

اس تمام بحث سے میرا مقصود یہ ظاہر کرنا تھا کہ قرآن کے معانی اور اسلوب دونوں اپنے اندر عقلی اپیل کے علاوہ ایک جذباتی اپیل بھی رکھتے ہیں جو اکثر اوقات غیر شعوری طور پر یا نیم شعوری طور پہ انسان کو متاثر کرتی ہے۔ قرآن نے اسکی ضرورت اسلیے محسوس کی کہ انسان محض ایک "عقلی حیوان" (Rational animal) ہی نہیں ہے بلکہ اسکی فطرت دوسرے اجزاء سے بھی مرکب ہے۔ اُس میں روحانی اور جذباتی عناصر بھی موجود ہیں۔ اور اسلام دین فطرت ہونے کے لحاظ سے وجود انسانی کے تمام پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھتا ہے اور اپنی اپیل کو مکمل بنانے کیلیے لازماً جذبات کو بھی حرکت میں لاتا ہے۔

جذباتی عنصر کی تعریف انسان کے اندر اور اسلیے دین کے اندر، جو جذباتی عنصر موجود ہے، اسکی تعریف اور تعیین، سائنٹفک الفاظ میں کر دینا میری بساط سے باہر ہے۔ غالباً اسکی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ چیز طبعاً اور لازماً ناقابل تعریف ہے۔ اسے محسوس کیا جا سکتا ہے، پر اسکا اظہار مشکل ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ انسان اپنی عقلی حدود سے پرے جانے کی کوشش کرتا ہے، اپنے افقِ نگاہ سے بعید کسی اور مملکت کو دیکھنے کے لیے بیتاب ہوتا ہے، اُسکے اندر ایک قلبی خلش ہوتی ہے کہ اس عالمِ چار سو کو پھاند کر لامکاں کی غیر محدود وسعتوں میں کھو جائے۔ ہمیں اِسکا بھی احساس ہے کہ دین اِن تمام مبہم آرزوؤں کا جواب اپنے اندر رکھتا ہے۔ اِن تمام بے قراریوں کی تسکین اُسکے پاس موجود ہے جو کبھی قلبِ انسانی کو مخاطب کلام اللہ بناتی ہے، کبھی محبت الٰہی کا دلآویز تخیل پیش کرتی ہے، اور کبھی آیاتِ الٰہی کا "سحرِ حلال" بن کر انسان کے تمام وجود کو مسحور کر لیتی ہے۔

ہم یہ سب کچھ محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اگر ہم سے کوئی پوچھے کہ انسان کے اندر اور دین کے اندر جو یہ فوق الادراکی عنصر (Super-rational element) پایا جاتا ہے یہ کیوں ہے اور کیا ہے تو شاید ہم کوئی واضح جواب نہ دے سکیں۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ یہ عنصر جن جن مختلف صورتوں میں ہمیں نظر آتا ہے، وہ بیان کر دیں۔ اور دین کی تاریخ میں یا دین کے ارکان میں جہاں کہیں ہمیں یہ

سرحد ادراک

چیز کارفرما نظر آئے، اُسکی مثال پیش کردیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی مثالیں بہت سی ہونگی جو بہ یک وقت سب کی سب مدنظر نہیں رکھی جاسکتیں، لہٰذا ان دو تین مثالوں کے علاوہ جو اوپر بیان کردی گئی ہیں، کچھ اور مثالیں پیش کی جائیںگی جن میں سوائے اسکے کہ وہ جذباتی عنصر کی مختلف صورتیں ہیں لازماً اور کوئی تعلق نہ ہوگا۔

فلسفۂ نماز سب سے پہلے نماز کو لیجیے۔ دن میں پانچ دفعہ نماز پڑھنے سے جو یاد دہانی ہوتی رہتی ہے جو فرض شناسی، پابندیٔ وقت، اور تعمیر سیرت ہوتی ہے، یہ تمام نماز کے خارجی فوائد اور لوازم ہیں۔ اسکی اندرونی توجیہہ (internal phenomenon) یہ ہے کہ انسان میں خدا پرستانہ جذبات جبلی طور پر موجود ہیں اسی لیے قرآن مدعی ہے کہ ہم نے لوگوں کو فطرتِ اسلام پر پیدا کیا (فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا)۔ اور جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے (کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ و ینصرانہ و یمجسانہ او کما قال) یہ جذبات اکثر اوقات کئی خارجی اثرات کی وجہ سے یا دب جاتے ہیں یا کسی اور معبود کی طرف منعطف ہوجاتے ہیں۔ نماز ان جذباتِ وجدانی کی بہ یک وقت انگیخت اور تسکین کا نام ہے۔ معبود کی عبادت کی حِس عبد کی فطرت میں پیوست کردی گئی ہے اور نماز اُس حس کو بار بار بیدار کرنے اور بہ یک وقت تسکین دینے کا ذریعہ ہے۔ اور وہ نماز جو انسان کے اُن وجدانی جذبات کو بیدار نہیں کرسکتی جو ایک فطری حس کے طور پر اُس میں موجود ہیں، اپنے مقصد کو فوت کردیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ نماز اِس طرح پڑھو گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو یا کم از کم اِس طرح گویا خدا تمہیں دیکھ رہا ہے۔ عبد و معبود کے درمیان قربت کا یہی رشتہ قائم کرنا نماز کا جذباتی مقصد ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر ایک خدا کی ہستی کا اقرار اور اسکے مقتضیات کی تعمیل محض عقلی طور پر کردینا ہی مقصودِ واحد ہوتا تو دن میں پانچ مرتبہ خاص خاص اوقات پر خاص خاص طریقوں سے عبادت کرنے کو شاید اتنی اہمیت نہ دی جاتی۔

اسلامی تاریخ میں جذبات کی مثالیں ایک طرف خداوندِ قدوس آدمی کے اندر اپنی ہستی کا شعور عقل و فکر کے ذریعہ سے پیدا کرتے ہیں (اسی لیے اَفَلَا یَتَفَکَّرُوْن، اور اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْن کی عبرت آموزیاں قرآن کے صفحات میں سے چمک رہی ہیں) دوسری طرف خداوندِ اکبر اپنی ذات کی محبت قلوب کے اندر وجدانی جذبات کی بیداری سے پیدا کرتے ہیں۔ اسی لیے اہل ایمان کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ٥ (الانفال - ۲)

جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، ان کے دل کانپنے لگتے ہیں اور جب اللہ کی آیات انکے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو اُنکا ایمان اور بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے پروردگار ہی پر بھروسہ کرتے ہیں۔

الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ (الحج - ۳۵)

وہ لوگ جو خدا کا ذکر سنتے ہیں تو ان کے دلوں میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔

اسلامی تاریخ ایسے واقعات کی بہت مثالیں پیش کرتی ہے، جن میں عقلی تجسس سے زیادہ محض جذباتی اپیل نے کام کیا۔ جس حد تک جذباتیات نے اشاعتِ اسلام میں حصہ لیا، اُس کا ہم صحیح اندازہ لگانے سے قاصر ہیں۔ اکثر دفعہ ایسا ہوا کہ لوگ محمدؐ ابن عبداللہ کی شخصی صداقت و امانت ہی کی بناپر رسول اللہ کے دعوئ رسالت پر ایمان لائے۔ انسان کی شخصیت کا طلسم نبیؐ کے معجزۂ نبوت کا معاون ہوا۔ "السابقون الاولون" میں سے کونسا ایک فرد بھی ایسا ہے جس نے اسلامی نظام کی تمام جزئیات میں جانے کی ضرورت محسوس کی ہو (جو سرے سے ابھی مرتب ہی نہیں ہوا تھا)۔ ان کے لیے اُس سرچشمۂ صدق و صفا کا دعوے ہی فقط اپنی دلیل آپ تھا۔ حضرت صدیقِ اکبر اور معراج کا واقعہ ہمارے سامنے ہے ظاہر ہے کہ یہ واقعہ حدودِ عقل سے ورا ہی نظر نہیں

آسکتا تھا بلکہ عقل کی عین ضد تھا - اس وقت کس چیز نے صدیقؓ کو اسکی صداقت کا یقین دلایا؟ یہ محض وہ جذباتی رشتۂ عقیدت تھا جو اُنکے دل میں رسولِ خدا کی ذات سے وابستہ تھا -

پھر فاروقِ اعظمؓ کے اسلام لانے کا واقعہ یاد کیجیے - ظاہر ہے کہ اُس وقت اہنیں اسلام کے اجتماعی فلسفہ، اسلام کے اخلاقی یا اقتصادی نظام پر غور کرنے کی نہ فرصت تھی نہ خواہش، نہ ہی اہنیں پرانے فلسفۂ حیات کو عقلاً غلط تسلیم کرنے کا موقع ملا (نئی تحریک کی جدت طرازیوں کا تھوڑا بہت مطالعہ انہوں نے ممکن ہے کیا ہو، لیکن وہ بھی ایک خالص دشمن کے نقطۂ نظر سے) اس پر طرّہ یہ کہ ارادۂ قتل سے جانیوالا آدمی لازماً ان عقیدتمندانہ جذبات سے بھی عاری تھا جو ایک خدیجہؓ، ایک علیؓ، یا ایک صدّیقؓ کے لیے مشعل ہدایت بن سکتے تھے - پھر کیا چیز تھی جس نے یکایک ذہنیت میں ایسا انقلاب عظیم برپا کیا؟ یہ چند آیات قرآنی کی سماعت تھی، اُس "الہٰی نغمہ" کی موسیقی تھی، اور وہ جذباتی تموّج تھا جو قرآن کی آیات پیدا کرنے پر قادر ہیں - اُدھر فاروقؓ کے ایمان لانے کی تاریخی اہمیت کا اندازہ لگا لیجئے اور پھر اس واقعہ کے اسباب پر غور کیجیے - آپ حیران رہ جائینگے کہ ایک لمحہ کے جذباتی تأثر نے کیا کام کر دکھایا!

جذبات کی کارفرمائیوں کی مثالیں جتنی چاہییں مل سکتی ہیں - اویسؓ کا واقعہ تو ایک انتہائی مثال ہے - لیکن صرف اُن غلاموں اور کنیزوں کے ناموں ہی پر نظر دوڑانا کافی ہوگا جو تپتی ہوئی ریتوں پر لٹائے جاتے اور جنکے سینوں پر پتھر رکھے جاتے اور پھر بھی اَحَد اَحَد ہی پکارتے - خدا کا کوئی عقلی تصور انسان کے اندر مصائب کی اس قدر مقاومت نہیں پیدا کر سکتا - ابوفکیہہ، بلالؓ، خبّابؓ، عمّارؓ، لبینہؓ، سمیّہؓ، نہدیہؓ کی عقلیں ہی اسلام کی حقانیت کو قبول نہیں کر چکی تھیں بلکہ ایمان ان کے رگ و ریشہ میں سما گیا تھا، اور وہ ایمان کی اُس منزل میں تھے جسے "عشق" کہا جاسکتا ہے - اگر آپ بلالؓ سے اسلام کے سیاسی نظام کے متعلق استفسار کرتے یا لُبینہؓ سے

اسلام کے اقتصادیات پر گفتگو کرتے تو شاید وہ لوگ حیرت سے آپکا منہ تکتے۔ لیکن باوجود اس کے دنیائے اسلام ایسی مثالیں آج تک پیدا کر سکی۔ لاکھ رازی و سینا اُن پر قربان کیے جا سکتے ہیں۔ اور یہ اسلیے کہ فقط اسلام کا علم اور اُسکا بہ حیثیت ایک مسلکِ فکر و عمل کے عقلی طور پر قبول کر لینا ہی کافی نہیں بلکہ تکمیل ایمان کے لیے ایک اور فطری عنصر کے نشو و نما کی ضرورت ہے جسے ہم جذباتی یا روحانی عنصر[1] کہتے ہیں۔

جذباتی عنصر مختلف ادوار میں مسلمانوں کی تاریخ پر نظر ڈالنے کا ایک دلچسپ طریق یہ ہو سکتا ہے کہ آپ اس نقطۂ نظر سے دیکھیں کہ کس کس دَور میں مسلمان "علم و عشق" کا وہ صحیح توازن قائم رکھ سکے جو دین کا فطری تقاضا ہے۔ عہدِ رسالت و خلافتِ راشدہ یقیناً ایک ایسا دَور ہے جس نے ایسے ایسے لوگ پیدا کیے جو بہ یک وقت عالم اور فقیہہ بھی تھے اور اپنی جانیں شمعِ نبوت پر پروانہ وار نثار کر دینے والے دیوانے بھی۔ جو آج اگر کسی خطبۂ نبوی کو سُن کر زار و قطار رو رہے ہیں تو کل شام و روم کی سلطنتوں کو زیر و زبر کر رہے ہیں۔ وہی آوازیں جو "صوت النبی" سے بلند ہونے کی ہمت نہیں رکھتیں، دنیا کی فضائیں اُنکے نعرہ ہائے تکبیر سے تھرتھرا رہی ہیں، اور کفر کی سلطنتیں انکی گونج سے لرز رہی ہیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ تاریخِ عالم کا کوئی طالبِ علم جو بے لاگ آنکھوں سے دیکھے، تمام دنیا کی تاریخ میں صدیقؓ، فاروقؓ، عثمانؓ، علیؓ، خالدؓ، ابوذرؓ، سلمانؓ، بلالؓ جیسا گروپ (Group) کسی ملک اور کسی زمانہ میں نہیں دیکھ سکے گا۔ انسانیت کے یہ مکمل ترین نمونے اپنے جامع الصفات ہونے کے لحاظ سے عدیم المثال ہیں۔

---

[1] "جذباتی" اور "روحانی" میں اگر کوئی فرق ہے تو اُسے لازمی طور پر دانستہ نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ غالباً روحانیت کو جذباتی ارتقا کی آخری منزل کہا جا سکتا ہے۔ دراصل ان تمام الفاظ کا مفہوم قدرے مبہم اور غیر متعین ہے۔ لیکن یہ ہمارے بس کی چیز نہیں۔ اور بالآخر ہم سائنس یا ریاضی سے دوچار نہیں ہیں کہ بغیر اصطلاحات کی سائنٹفک تعیین کے ہمارا کام نہ چل سکے۔

عصر حاضر غالباً اُس دور کے عین متضاد ہے - کیونکہ یہاں روحانیات کا تو خیر ذکر ہی کیا ما اسلام کا بنیادی ادراک اور شعور ہی مفقود ہے - باقی ادوار کی تاریخ بھی اپنی دوگونہ محرومیوں کی داستان ہے - چنانچہ آپ دیکھینگے کہ کبھی کوئی غزالی اسلامی شعور پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور کبھی کوئی رومی ایمانی جذبات کو بیدار کرنے کی سعی میں ہے -

تصوف کی ابتدا آٹھویں نویں صدی عیسوی میں اسلامی دنیا کے اندر "تصوف" کی ابتدا کے متعلق بہت سے نظریات (Theories) مشہور ہیں - ایک تو یہ ہے کہ خود قرآن کے اندر بعض آیات (بالخصوص وہ جنہیں "متشابہات" کہا جاتا ہے) اور بعض احادیث (جن میں سے اکثر متنازع فیہ ہیں) میں شجر تصوف کا بیج بو دیا گیا ہے اور جوں جوں خاص خارجی اثرات تاویل قرآنی پر اثر انداز ہوئے، مثلاً بارہویں تیرھویں صدی عیسوی میں ہلاکو اور چنگیز کے معرکوں نے جب بے ثباتی دنیا کا دلخراش منظر پیش کیا تو مذہب میں رہبانی قسم کے تخیلات کا خاص طور پر تجسس کیا گیا اور اس طرح وہ بیج موافق آب ہوا کے اندر پھلا پھولا -

دوسرا نظریہ وہ ہے جسے نسلی ردِ عمل (Racial reaction) کا نظریہ کہا جاتا ہے - اسکی رُو سے تصوف دراصل آرین قوموں کا سامی (Semitic) قوموں کے مسلط کیے ہوئے مذہب کے خلاف ردِ عمل ہے - عجمی بالخصوص ایرانی طبعی طور پر ما بعد الطبیعاتی بھول بھلیوں میں کھو جانے کے مشتاق ہیں - اُن پر عربوں نے انکی طبائع کے خلاف ایک عملی مذہب مسلط کر دیا تھا، جسکا لازمی ردِ عمل تصوف کی فلسفیانہ صورت میں نمودار ہوا - غیر مسلم مورخین نے اس نظریہ کو خاص وقعت دی ہے -

تیسرا نظریہ یہ ہے کہ یونانی علوم کی ترویج، عیسائیت اور بدھ مت کے ساتھ ربط، اِن خارجی اثرات سے جب اسلام متأثر ہوا تو اس کا فطری نتیجہ تصوف تھا -

چوتھا نظریہ یہ ہے کہ اکثر تحریکات کی طرح تصوف بھی ایک اندرونی تحریک تھی جو خود بخود نفسیاتی

وجوہ کی بنا پر ظہور میں آئی اور جو بعد میں خارجی اثرات سے بھی لازماً متاثر ہوئی۔

حقیقتِ حال جس طرح بھی ہو، ایک بات خاص طور پر قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ تصوف نے عین اُسی عنصر کو اہمیت دی، جسے ہم جذباتی یا روحانی عنصر کہتے ہیں۔ جب سے خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوئی تھی، اسلام کے بدن سے گویا روح غائب ہوگئی تھی۔ یوں تو خلیفہ کا برائے نام انتخاب بھی ہوتا رہا، اسلامی شعائر بھی ظاہری پابندی سے قائم کیے گئے، بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد میں دار الافتا بھی اسی طرح قائم تھے جس طرح خلافت راشدہ میں، قضا بھی موجود تھی، مسجدیں آپکو مروان بن عبدالملک کے عہد میں بھی بارونق نظر آئینگی، حج و زکوٰۃ کا سلسلہ بھی باقاعدہ جاری تھا، اسلام ایک مشینی باقاعدگی (Mechanical regularity) اور مشینی بے شعوری کے ساتھ چل رہا تھا۔ باہر سے تو سب کچھ ویسا ہی تھا جیسے پہلے ہوا کرتا تھا لیکن پھر بھی دنیائے اسلام ایک لاش تھی جسکے اندر سے جان پرواز کرگئی تھی۔ ایک گھُن تھا جو اندر ہی اندر اسے کھوکھلا کر رہا تھا۔ اور وجہ یہ تھی کہ اللہ کی حاکمیت کے بجائے بندوں کی حاکمیت میں گرفتار ہوتے ہوئے بھی لوگ محض ظاہری شعائر کی پابندی کو اسلام سمجھ رہے تھے۔ اور ظاہر بیں آنکھیں دور سے ایک ڈھانچے کو جس میں سے روح غائب تھی، قالب زندہ خیال کر رہی تھیں۔

لیکن بعض حساس طبائع اِس کمی کو محسوس کر رہی تھیں۔ اور وہ اپنے زمانہ کے خلاف اگرچہ اجتماعی طور پر بغاوت نہ کرسکیں تاہم اپنی اپنی استطاعت کے مطابق انہوں نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ تصوف دراصل دین کے اُن جذباتی اور روحانی عناصر کا احیا (Renaissance of emotional and spiritual elements in religion) تھا جو اُس دور میں اسلام کی مشینی کارروائی کے اندر کچلے گئے تھے۔ جنیدؒ اور بایزیدؒ اپنے زمانہ کی بے روح علمیت کے خلاف جذبات اور روحانیت کے احتجاج کے نام ہیں ——!

بیعت کا نفسیاتی اثر جذبات کے اس احیاء نے سلسلۂ بیعت کو اپنا آلۂ کار بنایا، کیونکہ بیعت ایک پاکیزہ اور صاحبِ علم وعمل انسان سے ایک جذباتی رشتۂ عقیدت قائم کرکے نہ صرف علمی منازل آسانی سے طے کروا سکتی تھی بلکہ عملی زندگی کو صالح تر بناتی تھی۔[1] بیعت کی اصلی سپرٹ یہ تھی کہ ایک ایسے انسان کی صحبت جو فکر وعمل میں اتباعِ رسولؐ کا پیکر ہو، رشتۂ محبت کے ذریعہ سے بلاواسطہ تعمیرِ سیرت میں معاون ہو جائے۔ آج ہم بیعت کے صرف تاریک پہلو ہی سے دوچار ہیں۔ لیکن اس دور میں جب اسلام ایک مشین کی طرح چلایا جا رہا تھا، بیعت کے نفسیاتی اثر کی اہمیت کم نہیں کی جاسکتی۔ بیعت عین اُسی جانی عنصر کی بیداری کا وسیلہ بنی جس کا فقدان عالمِ اسلام کو ایک قالبِ بے جان بنائے ہوئے تھا۔ بیعتِ شیخ کے واسطے سے عبد و معبود کے درمیان ایک جذباتی رشتۂ محبت پیدا کرتی تھی اور محبت عمل پر جس طرح اثر انداز ہوسکتی ہے، صرف علم وعمل کی بساط سے باہر ہے

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

لیکن کم علم اور نااہل لوگوں کے ہاتھوں بیعت لازماً ایک نہایت خطرناک آلۂ کار بن گئی۔ "فنا فی الوجود"، "فنا فی الشیخ" اور "فنا فی الرسول" کی منزلوں میں سے ایک ایک زبردست خطرات

---

[1] عہدِ رسالت کے مسلمانوں اور بعد کے مسلمانوں میں ایک نہایت بنیادی فرق یہ ہے کہ اگرچہ ظواہر میں اکثر دونوں یکساں ہیں تاہم پہلے مسلمانوں کے قلوب میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت سے ایک والہانہ الفت موجود ہے جو اسلامی شعور کے ساتھ ساتھ اُن کے تمام اعمال کی محرک ہے۔ بعد میں یہی جذباتی عنصر گم ہے۔ صوفیائے کرام نے اسی عنصر کو شخصی نوتدع اور اخلاقِ نبوی کی مثالیں پیش کرکے دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی، اور تصوف کی نفسیاتی توجیہہ یہی ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی کہ نیستاں اِس قدر زخم خوردہ ہو گیا کہ یہ شرارے اسے یکسر جلا نہ سکے۔

سے معمور تھا، کیونکہ ہر ایک کے مقصود بالذات بن جانے کا خطرہ ہر لمحہ لاحق رہتا تھا طریقت، حقیقت اور معرفت کی راہیں رہزنوں سے پُر تھیں - چنانچہ جلد ہی حدِّ اعتدال سے تجاوز ہوا، اس پر طرّہ یہ کہ اس اندرونی خطرہ کے علاوہ تصوف پہ مسیحیت، یونانیت، اور ہندو فلسفہ کے خارجی خطرات بھی حملہ آور ہوئے، اور عین وہی چیز جو جسدِ بے روح میں روح پھونکنے آئی تھی، ایک مستقل بیماری کی طرح اس جسم کے ساتھ ہمیشہ کے لیے پیوست ہو گئی جسکے جراثیم سے آج کے عقلی دور (Age of reason) کی فضائیں بھی محفوظ نہیں ہیں -

ردِّ عمل حدِّ اعتدال سے تجاوز کا نتیجہ طبعی طور پر ایک ردِّ عمل کی صورت میں نمودار ہوا - بگڑے ہوئے صوفیوں کی پھیلائی ہوئی بدعات کے خلاف متعدد اصلاحی تحریکیں اٹھیں جن میں سے آخری تحریک کا معروف نام "وہابیت" ہے - اور جب وہابیت خود اعتدال سے منحرف ہوئی تو اُس نے پھر اسی قالب بے جان کا نقشہ پیش کر دیا - اگر تصوف بھی روحانیت سے گذر کر باطنیت (Mysticism) بن گیا تو اسکا ردِّ عمل اصلی دینداری سے گذر کر خالی خولی ظاہریت (formalism) بن کر رہ گیا - اس افراط و تفریط کے اندر راہِ اعتدال کسے نظر آتی، اور علم و عشق، افکار و جذبات کا وہ خوبصورت توازن جو اسلام پیش کرتا ہے، کس کو دکھائی دیتا -

اسلامی اور جاہلی جذبات میں فرق حقیقت یہ ہے کہ اسلام جب بھی تحریک کی حیثیت سے ابھرا، اس نے اپنے متبعین سے توقع کی کہ انکی تمام حیات، انکی تمام ہستی، انکے وجود کی تمام قوتیں محض ایک ہی مقصد پر مرتکز ہو جائیں - اُسکی تسلی صرف اس بات سے کبھی نہ ہوئی کہ اُسے محض عقلی و علمی طور پر بہ حیثیت ایک مسلکِ حیات کے تسلیم کر لیا جائے - اُس نے انسان سے عقلی بیعت ضرور لی، لیکن اسی پر اکتفا نہیں کیا - اُس نے اُن تمام نفسیاتی عناصر سے کام لیا جو آدمی کی زندگی پر مختلف طریقوں سے اثر انداز ہوتے ہیں - اُس نے عقل و فکر کے علاوہ آدمی کی جبلت، اُس کے وجدان، اسکے

جذبات، اُسکے "فوق الادراکی" رجحانات، سبھی کو بہ یک وقت حرکت دی - کیونکہ انسان کی تمام مختلف قوتیں کسی مقصد کیلیے مجتمع اور مرتکز ہو ہی نہیں سکتیں جب تک کہ اُن سب کو بیدار نہ کیا جائے - اگر اسلام محض چند عقائد کا مجموعہ ہوتا یا اُسکا مقصد صرف اتنا ہوتا کہ بعض خاص خاص نظریات ذاتِ خدا سے متعلق یا حیات بعد موت وغیرہ سے متعلق پھیلا کر اپنے آپ کو سبکدوش سمجھے، تو شائد اُسے فطرتِ انسانی کے تمام بوقلموں عناصر کو مدنظر رکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ لیکن اُسے عملی طور پر دنیا میں ایک پوری تہذیب کی بنیاد ڈالنی تھی -

جاہلیت کی یہ خاص کمزوری ہے کہ وہ "پورے آدمی" (The whole of man) کو کبھی اپیل نہیں کر سکتی - بعض مذاہب کی عبادات، شراب و کباب، اور راگ رنگ کی صورت اختیار کر لیتی ہیں - کئی اور قدیم اقوام کے ہاں ناٹک، سانگ اور "مذہبی ناچ" ہوتے ہیں جو حاضرین پر ایک خاص قسم کا جذباتی تاثر پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتے - لیکن وہ تاثر اس سے چنداں مختلف نہیں ہوتا جو ایک فوج کے لباس اور بیرونی ٹیپ ٹاپ دیکھنے سے وقتی طور پر پیدا ہو جاتا ہے، یا جیسا کہ ملٹری بینڈ سننے سے خود بخود پاؤں میں ایک تحرّک سا محسوس ہوتا ہے - لیکن ظاہر ہے کہ یہ سارا تاثر وقتی اور عارضی ہوتا ہے - یہ کبھی ساری زندگی کی رہنما طاقت نہیں بن سکتا[1] اور یہ ہمیشہ چند سفلی قوتوں کی بیداری اور بلند تر قوتوں کے تعطل پر مشتمل ہوتا ہے -

اسلام کا چونکہ مقصد بلند ہے اس لیے لازماً ذرائع بھی بلند ہیں - وہ اس قسم کے اوچھے ہتھیار استعمال نہیں کرتا جن سے انسان کی بعض قوتیں بلند تر قوتوں کو معطل کر کے بیدار کی جائیں وہ کبھی اپنی لڑائی ایک ایسے سپاہی سے نہیں لڑوانا چاہتا جو محض ملٹری بینڈ کی موسیقی سے کھچ کر بغیر سوچے سمجھے اُسکی صفوں میں شامل ہو گیا ہو - اسکے برعکس اسلام ایک نہایت مختلف قسم کا جذباتی

[1] چنانچہ آپ دیکھینگے کہ ایسی اقوام میں دین اور دنیا، زندگی اور مذہب بالکل جداگانہ چیزیں ہوتی ہیں جنھیں ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

تاثر پیدا کرنا چاہتا ہے جو نہ صرف طبعاً بلند ہو بلکہ دائمی بھی ہو اور پوری زندگی میں کارفرما ہو سکے یہ جذباتی تاثر محبتِ الٰہی کے قرآنی تصور سے پیدا ہوتا ہے جسکی رو سے اللہ اور بندے کے درمیان محض حاکم و محکوم ہی کا رشتہ نہیں، بلکہ اس سے زیادہ قریبی (اور زیادہ پُر زور) رشتہ بھی موجود ہے۔ یہی جذباتی تاثر آپکو قرآن کے طرزِ تخاطب، اُسکی معنویت اور اُسکے اسلوبِ بیان سے ٹپکتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی چیز ایمان بالغیب کی بنیاد ہے۔ یہی آپکو اُس اندرونی اور وجدانی تحریک میں جلوہ فرما نظر آتی ہے جو انسان کو نماز کے اندر اپنے معبود کے سامنے سجدہ ریز کرتی ہے۔ یہی چیز آپکو رسولؐ اور صحابہؓ کے باہمی رابطہ کی سنہری زنجیر دکھائی دیتی ہے۔ حیدر، صدیق، فاروق ایمان کی اسی شمع کی ضیاء سے چمک رہے ہیں۔ ابوذر اور بلال کے سینے اسی نور سے منور ہیں۔

عشقِ رسول کی اہمیت یہ جذباتی عنصر کہیں بھی اس طرح نمایاں طور پر آشکارا نہیں ہوتا جس طرح کہ مسلمانوں اور اُنکے رسولؐ کے درمیانی تعلقات کی نوعیت میں۔ دنیا کی تاریخ آپکے سامنے ہے کسی تحریک کے لیڈر نے آج تک اپنے متبعین کے ساتھ مودّت و محبت کا ایسا استوار اور ناقابلِ شکست پیمان نہیں کیا جو رسولؐ عربی نے پیروانِ دعوتِ اسلامی کے ساتھ کیا۔ اور کسی واحد انسان نے نوعِ انسانی کی مسلسل نسلوں سے متواتر، زمان و مکان کے لامحدود بُعد کے باوجود، کبھی اتنا خراجِ عقیدت و الفت وصول نہیں کیا جتنا کہ اس نبیٔ اُمیؐ نے۔[1]

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، روسو، مارکس، یا نطشہ سے محبت کیے بغیر اُنکے فلسفۂ حیات کا اتباع کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ جب تک اس کے لیڈر سے آپکو انتہا درجہ کی محبت نہ ہو، آپ خواہ عقلی طور پر اس کی بنا کردہ تحریک کے قائل بھی ہو جائیں

[1] وہ آواز جو "اَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰہ" کے الفاظ میں اذان کے اندر صبح و شام چوبیس گھنٹوں میں ہر وقت کرۂ ارض کے کسی نہ کسی حصہ میں، خطِ استواء کے جُھلستے ہوئے گرم میدانوں سے کرہمالہ کی برفانی چوٹیوں تک، کہیں نہ کہیں ہر لمحہ گونج رہی ہوتی ہے، "وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ" کی بہترین تفسیر ہے!

آپ صحیح معنوں میں مسلمان نہیں کہلا سکتے - چنانچہ ارشادِ نبوی ہے :

لا یومن احدکم حتیٰ اکون — تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک
احب الیہ من والدہ وولدہ — کہ میں اس کو اسکے باپ اور بیٹے اور تمام انسانوں
والناس اجمعین - — سے زیادہ محبوب نہ ہوں -

کسی حد تک یہ ایک عجیب تقاضا ہے جو ایک عملی تحریک کا لیڈر اپنے ایک متبع سے کرتا ہے اتباع، ڈسپلن، اطاعت، ہر ایک لیڈر اپنے متبع سے ان چیزوں کی توقع رکھے گا - لیکن محبت، اور اس نوعیت کی محبت —— ! غالباً آج تک کسی ایک انسان نے باقیماندہ انسانیت سے کبھی یہ توقع نہیں رکھی تھی اور ایسا تقاضا نہیں کیا تھا —— !

یوں تو ایک سوشلسٹ بھی ایک خاص نظریۂ حیات کا پیرو ہے اور ایک مسلمان بھی ایک خاص فلسفۂ زندگی کا متبع - وہ بھی ایک تحریک کا رکن ہے، اور یہ بھی - لیکن اِن دونوں میں ایک نہایت بنیادی فرق ہے - ایک نے اُس خاص نظریہ اور اسکے بانیوں کے ساتھ صرف عقلی بیعت کی ہے - اُسکے جذبات، اُسکی عقیدتیں، اُسکی محبتیں آزاد چھوڑ دی گئی ہیں کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اپنے لیے جو راہیں تلاش کرنا چاہیں کریں، جذباتی زندگی کی جو قدور (Values) معین کرسکیں کرلیں - لیکن دوسرے نے اپنے نظریۂ حیات کو صرف عقلی طور پر ہی تسلیم نہیں کیا، بلکہ اُس نے اپنے ہادی کے ساتھ جذباتی بیعت بھی کی ہے - اسکے جذبات، اسکی عقیدتوں، اُسکی تمام محبتوں کے لیے پہلے ہی سے راہیں متعین ہیں - جسکا نتیجہ یہ ہے کہ اُسکی عقلی اور جذباتی قدور (Moral and emotional values) میں تضاد نہیں، اُسکے تمام نفسیاتی تقاضے اپنی اپنی جگہ پر مطمئن ہو رہے ہیں، اسکی پوری شخصیت کے تمام اجزا بغیر باہمی مخاصمت کے، انتہائی مطابقت (Harmony) کے ساتھ ایک ہی مقصد کے لیے ایک ہی راہ پر چل رہے ہیں ——

غالباً اقبالؒ کے پیشِ نظر عقلی اور فوق العقلی قدور کا یہی غیر متصادم اختلاط تھا جب انہوں نے کہا:

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے
یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں!

"یہ نہایتِ اندیشہ" وہ عقلی و علمی بعیت ہے جسکے ذریعہ سے اسلام اپنی حقانیت تسلیم کرواتا ہے اور یہ "کمالِ جنوں" اُس روحانی و جذباتی جوشِ محبت کا نام ہے جو خدا اور رسولؐ کی ذات[1] سے وابستہ ہو کر اسلامی تحریک چلانے کے لیے پہلے فرد اور پھر جماعت کی تمام قوتوں کو مجتمع کرتا ہے۔ محبت ایمان و عمل دونوں کی پختہ ترین بنیاد ہے۔ اِسکے بغیر اتباعِ مکمل کا تصور ناممکن ہے۔ اِسکے بغیر انسان کے عملی قویٰ مستِ خواب ہیں۔ اسکے بغیر عقل و شعور گم کردہ راہ ہیں۔ بھٹکے ہوئے مسافر، نشانِ منزل سے محروم، اور دین؟ چند خاص نظریات کا ایک مجموعہ، مختلف نظامات کا ایک ڈھانچہ جسکے اندر آج تو انسان کی محدود اور ناقص عقل کو انسانیت کی فلاح نظر آرہی ہے لیکن ممکن ہے کل نظر نہ آئے۔

عقل و دل و نگاہ کا مُرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات!

عشق ہی سے ہر مقصد کو دوام ہے۔ عشق ہی سے ہر آئیڈیل (Ideal) کے اندر آمادۂ عمل کرنے کی آتشیں قوت ہے۔ یہ نہ ہو تو بلند سے بلند نصب العین آپ کے جمود کو نہیں توڑ سکتا۔ یہ ہو تو آپ اپنا سب کچھ لُٹا دینے کے بعد بھی یہی کہینگے۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

[1] ظاہر ہے کہ خدا اور رسولؐ کی محبت دراصل ایک ہی چیز ہے کیونکہ ایک کے بغیر دوسری کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

اگر یہ ہو تو سینہ نورِ ہدایت سے منور ہے، زندگی میں ایک معنی موجود ہے۔ یہ نہ ہو تو حیاتِ ارضی ایک چکر ہے، لامتناہی و بے مقصود! یہی زندگی کی سب سے بڑی رہنما قوت (Guiding force) ہے یہ اسی کا کرشمہ ہے کہ آدمی کے اندر ایک خاص جاذبیت، اُسکی شخصیت میں ایک خاص کشش پیدا ہوتی ہے اور اسکی طبیعت میں سے وہ ناقابلِ اظہار چیز جھلکنے لگتی ہے جسے "سوز" یا "روحانیت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ "سوز" اور "روحانیت" جتنی ہی ناقابلِ بیان چیزیں ہیں اتنی ہی ناقابلِ انکار اور اہم۔

اسی سلسلہ میں مَیں بعض اور اصطلاحات کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جو بالخصوص اقبال کی شاعری میں آپ کو جا بجا نظر آئینگی۔ مثلاً ذکر و فکر، عقل و دل، سوز و ساز، آہِ سحرگاہی، کلیمی و حکیمی، جمال و جلال، علم و عشق[1] وغیرہ۔ یقین جانیے یہ محض شاعرانہ ترکیبیں نہیں ہیں جو صرف حسنِ کلام کے لیے وضع کرلی گئی ہیں۔ بلکہ یہ اسلام کے مخصوص مزاج کی طرف اشارہ کرتی ہیں جس میں عقلیات اور جذباتیات، طبیعیات اور روحانیات کا ایک دلچسپ امتزاج اور ایک خوبصورت توازن موجود ہے جہاں فکر کے ساتھ ساتھ ذکر موجود ہے اور حکیمی کے ساتھ کلیمی، اور علم کے ساتھ عشق

[1] انسان کی "ادراکی" اور "فوق الادراکی" کیفیتوں کے درمیان ایک واضح حدِ فاصل قائم کرنا نہایت مشکل ہے کیونکہ دراصل یہ کہا نہیں جاسکتا کہ آدمی کب اسکی سرحد پار کرکے اُسکی حدود میں داخل ہوا۔ اسی طرح "علم" اور "عشق" کے درمیان تضاد پیدا کرنا بھی غیر ضروری ہے۔ "ذکر" کو "فکر" کے خلاف صف آرا کرنا اور یہ سمجھنا کہ ایک دوسرے کے برعکس ہے، یہ بھی ایک غلطی ہے حقیقت صرف اتنی ہے کہ وہ فکر جو ذکر کی رفاقت اور رہنمائی سے محروم رہے، گمراہ کن ہے۔ اسی طرح وہی علم صحیح معنوں میں علم کہلائیگا جو عشق سے ہمکنار کرے۔

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہو جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم

عشق صحیح علم کے ارتقا کا فطری تقاضا ہے، ایک دوسرے کی ارتقائی شکل کا نام ہے۔ انکے درمیان تضاد و تخالف پیدا کرنا انسان کی پیچیدہ نفسیات کو جبری سادگی میں ڈھالنے کی کوشش (Over-simplification) ہوگی لیکن جو چیز یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ ان میں تضاد نہیں، لیکن یہ دو الگ الگ (distinct) کیفیتیں ہیں اور ایک بغیر دوسرے کے قابلِ اعتماد نہیں۔

اور ہر ایک بغیر دوسرے کے نامکمل ہے -

آج کی ضرورت افکارِ پریشاں کے اس مجموعہ میں سے دو نتائج خاص طور پر مرتب ہوتے ہیں جو نہایت ہی اہم ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام محض ایک عقلی و علمی نظام حیات نہیں اس میں "فوق الادراکی" عناصر بھی موجود ہیں - وہ انسان سے صرف عقلی بیعت ہی نہیں لیتا بلکہ اسکی جذباتی اور روحانی قوتوں کو بھی عمل میں لاتا ہے - دوسرے یہ کہ بغیر اُس جذباتی عنصر کے جو ایمان کا ایک ضروری جزو ہے ایمان کی تکمیل نہیں ہو سکتی - دین کی صداقت کو صرف عقلی طور پر تسلیم کر لینا ہی کافی نہیں -

آج آپ چاروں طرف نظر دوڑائیں، ایک طرف آپکو اربابِ تصوف نظر آئینگے جن میں علمی تفکر کا فقدان مضحکہ خیزی کی حد تک ہوگا - دوسری طرف علماء کا طبقہ ہے جس میں آپ روحانیت اور سوز کے ایک ذرہ تک کو ترسیں گے، جنکے اندر آپکو ایک خاص قسم کی برودت، جمود، اور یبوست نظر آئے گی، جن میں اُس جذباتی عنصر کی افسوسناک کمی ہوگی جو اسلام کے مقتضیات میں سے ہے - ہر سمت اسی افراط و تفریط سے آپ دوچار ہونگے - کہیں آپکو وہ جامعیت نظر نہ آسکے گی جو صحابۂ کرام کا طغرائے امتیاز ہے - آج اس امر کی ضرورت ہے کہ جہاں اسلام کے مکمل نظام کی تدوین کی جارہی ہے، اُسکے فلسفۂ اخلاق و اقتصادیات و سیاسیات مرتب کیے جارہے ہیں، وہاں اِس حقیقت کو فراموش نہ کیا جائے کہ اسلام کے احیاء کے لیے یہ سب کچھ انتہائی ضروری ہے، مگر صرف یہی کافی نہیں - پیشتر اسکے کہ جماعت کی مجموعی قوتیں تحریک چلانے پر مرکوز ہو سکیں افراد کی تمام انفرادی قوتیں بیدار اور مجتمع کرنا ضروری ہے - اور یہ صرف اس طرح ممکن ہے کہ آپ افراد کی عقل کو مطیع کرنے کے ساتھ ہی انکے اندر اس قسم کے جذباتی اور روحانی عناصر کی نشو و نما کو بھی پوری اہمیت دیں جو آپکو صحابۂ کرام کی زندگی کی سب سے بڑی قوت متحرکہ نظر آتے ہیں، اور اسلامی تاریخ کے ابتدائی صفحات جنکی کارفرمائیوں کے آئینہ دار ہیں ——!